اقبالؒ بحیثیت مفسرِ قرآن

اقبالؒ کی نظر میں قرآن پیغامِ انقلاب ہے

جی اے حق محمد

قرآن مجید اسلامی طرز زندگی کا مرکز و محور ہے یہ ایک ایسا آئینِ فطرت اور دستور انسانیت ہے جس نے ہر اس قوم کو بام عروج تک پہنچایا جس نے اس سے رہنمائی حاصل کی قرآن مجید کی اس قدر تفاسیر لکھی گئی ہیں کہ دنیا کی کسی اور کتاب پر اتنی خامہ فرسائی نہیں گئی۔ ہمارے پرانے (متقدمین) مفسرین نے ضخیم کتابیں مرتب کی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب اپنی جداگانہ خصوصیت رکھتی ہے۔ اپنے وقت میں ایک چیز خوبصورت اور فائدہ رساں ہوتی ہے۔ مگر وقت کے تقاضے بدلتے ہی وہی چیز اسی طرح مفید یا پرکشش نہیں رہتی۔ علمائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ مفسرین کی تحریر کردہ ہر بات اس رتبہ کی حامل نہیں ہوتی کہ اس کو اللہ کے کلام کا اصل مقصد قرار دیا جائے اور نہ ہی وہ مفسرین اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی نقل کردہ روایات اللہ کے کلام کا اصل مُراد ہیں بلکہ اکثر مفسرین کا مقصد لغوی وسعت یا بلاغت کی وجہ سے پیدا ہونے والے مختلف احتمالات کو قلمبند کر دینا ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خود مفسرین کے نزدیک ان تفسیری روایات کا از روئے سند اور عبارت وہ مقام نہیں ہوتا جو محدثین کے نزدیک حدیثوں کی روایات کا ہوتا ہے بلکہ مفسرین کبھی کبھی ایسے اقوال و احتمالات بھی ضبطِ تحریر میں لے آتے تھے۔ جو اصول دین سے متعارض ہوتے تھے اور اس سے ان کا مقصد کوئی حقیقت منوانا نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ صرف کسی قول یا احتمال کو ریکارڈ میں لانا ہوتا تھا خواہ وہ صحیح ہو یا غلط،

بعض مفسرین کسی ایک فن میں مکمل مہارت رکھتے تھے اس لیے وہ اپنی تفسیر اسی زاویہ سے لکھتے تھے اور ضمناً اس فن کی تفصیلی مباحث بھی چھیڑ دیتے تھے۔ یہ سب باتیں اپنے وقت میں بہت اعلیٰ اور پیاری معلوم ہوتی تھیں۔ مگر اب ہم اپنی نوجوان نسل کو تفاسیر قرآن کی ایسی بھاری بھرکم بڑی بڑی جلدیں نہیں تھما سکتے۔ کہ ان کو پڑھیئے اور زندگی کے تمام معاشی و معاشرتی مسائل کے حل تلاش کیجیئے۔ جس طرح کہ آج ہم کسی کو یہ نصیحت نہیں کر سکتے کہ بھائی اگر تمہیں سینکڑوں میل کا سفر طے کرنا ہے تو ہوائی جہاز یا ریل گاڑی کی بجائے بیل گاڑی پر سوار ہو جایئے۔ اگرچہ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہ جس وقت کسی نے بیل گاڑی ایجاد کی تھی تو یقیناً اس نے دنیائے انسانیت کی گرانقدر خدمت انجام دی تھی۔ آج وقت بڑی تیزی کے ساتھ گذر رہا ہے اور وقت کے تقاضے بھی اسی سرعت سے تبدیل ہوتے چلے جا رہے ہیں آج ہر چیز سائنسی انداز اپناتی جا رہی ہے آج کی دنیا میں ہمیں جو کچھ کہنا ہے وہ جسقدر مختصر ہو سکے اسی قدر مؤثر اور قابلِ قبول عام ہوگا۔

وقت کے انہی بدلتے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر قرآن مجید کو انسانیت کی عام بھلائی کے لیے بالکل سائنسی اور سادہ انداز میں پیش کرنا ہوگا اس کا احساس ہمیں علامہ اقبال نے دلایا ہے وہ کہتے ہیں

قرآں میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلماں
اللہ کرے تجھ کو عطا جدّتِ کردار

ان کی تمنا تھی کہ وہ خود قرآن مجید کی ایسی تفسیر لکھیں جو عام معاشرتی اور قومی مسائل میں نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ کا کام دے سکے۔ جس طرح انھوں نے سر راس مسعود کو ۲۶ اپریل ۱۹۳۵ء میں لکھا۔

"اور اس طرح میرے لیے ممکن ہو سکتا کہ میں قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں اپنے وہ نوٹ تیار کر لیتا جو عرصہ سے میرے زیر غور ہیں، لیکن اب تو نہ معلوم کیوں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میرا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکے گا۔ اگر مجھے حیات مستعار کی بقیہ گھڑیاں وقف کر دینے کا سامان میسر آئے تو میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کریم کے ان نوٹوں سے بہتر میں کوئی پیشکش مسلمانانِ عالم کو نہیں کر سکتا۔"

پھر حضرت علامہ ۳۰ مئی ۱۹۳۵ء کو انھیں لکھتے ہیں "چراغ سحر ہوں بجھا چاہتا ہوں تمنا ہے کہ مرنے سے پہلے قرآن کریم سے متعلق اپنے افکار قلمبند کر جاؤں۔" علامہ نے قومی، سیاسی،

یا عام معاشرتی مسائل پر جن نظریات و افکار کا اظہار کیا ہے وہ ہر لحاظ سے قرآن مجید کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ بلکہ ہمیشہ قرآن مجید ان کے قلب و دماغ میں رچا بسا رہا ان کے افکار و نظریات کی روشنی قرآن مجید کی چھلنی سے چھن چھن کر نور پھیلاتی رہی۔ وہ خود مولانا سید سلیمان ندوی کو ۱۴ مئی ۱۹۳۲ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "اگرچہ یورپ نے مجھے بدعت کا چسکا ڈال دیا ہے تاہم میرا مسلک وہی ہے جو قرآن کا ہے"۔ حضرت علامہ اپنی سوچ کے ہر زاویہ پر قرآن مجید کی چھاپ ضروری تصور کرتے ہیں۔

گر دلم آئینہ بے جوہر است ور بحرفم غیر قرآں مضمر است
روز محشر خوار و رسوا کن مرا بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اقبال عظیم فلسفی بھی تھے اور انھوں نے فلسفہ کے کئی پیچیدہ مسائل پر بہت کچھ کہا ہے ان کا یہ کلام خالص فلسفیانہ زبان میں ہے مگر اقبال برٹرینڈ رسل کی طرح فلسفیانہ افکار و مسائل کو عوام کے لیے پیش کرنے کے قائل نہ تھے۔ کیونکہ فلسفہ کا ایک مخصوص مقام ہے اس کے قارئین اور شائقین کا ایک خاص طبقہ ہے عوام میں فلسفیانہ مباحث چھیڑنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے اقبال کلام خداوندی کی آسان مؤثر اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تفسیر کے خواہاں تھے کیونکہ خدا کا پیغام جو عام انسانوں کی عام معاشرتی زندگی کے لیے ہے اسے عام انسانوں کی زبان ہی میں پیش کرنا ضروری ہے۔

تفسیر و تاویل

علامہ اقبال کے نزدیک غیر ضروری تاویلات کے بھنور میں پھنس کر اپنے ساتھ ہر انسان کو چکرا دینے سے متنفر کرنے والی بات ہوتی ہے ایسی تاویلات کے بارے میں کہتے ہیں۔

زمن با صوفی و ملا سلامے کہ پیغام خدا گفتند مارا
مگر تاویل شاں در حیرت انداخت خدا و جبرئیل و مصطفےٰ را

قرآن مجید کی تفسیر کا ایک حصہ تاویل بھی ہے۔ اوائل اسلام میں تاویل و تفسیر دونوں کا ایک مفہوم لیا جاتا تھا۔ مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ مفسرین مختلف آراء اور گوناں گوں خیالات کا اظہار کرنے لگے اس لیے تاویل کو تفسیر سے جدا معنی میں لیا جانے لگا۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ مفردات

القرآن کی شرح تفسیر ہے مگر کلام کے مجموعی مفہوم کا بیان تاویل ہے" امام قشیری کہتے ہیں کہ "تفسیر سماع اور اتباع پر موقوف ہے جب کہ تاویل استنباط و اجتہاد کا نام ہے" اور علامہ ثعلبی ان دونوں میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "تفسیر سے مراد یہ ہے کہ کسی لفظ کے ایسے معانی بیان کئے جائیں جن کے لیے وہ لفظ وضع کیا گیا ہے اور تاویل یہ ہے کہ موضوع معانی کی بجائے باطنی مطالب کی تفصیل بیان کی جائے۔"

علامہ اقبال بھی بحیثیت مفسر قرآن "تاویل" کے بارے میں ایک نکتہ نظر رکھتے ہیں جو انھوں نے مختلف مواقع پر مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے۔ مثلاً جناب نذیر نیازی کے نام اپنے ایک خط میں رقمطراز ہیں: "آیت نور کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اسے تاویل کہنا صحیح نہیں ہے۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے الفاظ کے عام معانی چھوڑ کر کوئی اور معانی لیے جائیں میں نے لفظ نور کے وہی معنی لیے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے اگر آپ کہیں کہ اس آیت میں "نور" علیٰ ھٰذا القیاس "زجاج" وغیرہ سے کچھ اور مراد ہے تو یہ تاویل ہوگی۔ میں نے اپنے تمام لیکچرز میں اس قسم کی تاویل سے پرہیز کیا ہے اور الفاظ کو انہی معنوں میں لیا ہے جن میں عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ حضور رسالت مآب کا یہی طریقہ تھا۔ یہی طریق بحث ابن حزم کا ہے مولانا روم کا یہ شعر میرے لیے نہ صرف دلیل راہ ہے بلکہ سوز و گداز کا بھی سامان ہے۔

کردۂ تاویل حرف بکر را — خویش را تاویل کن نئے ذکر را

تاویل کے بارے میں حضرت علامہ کا نظریہ جیسے کہ انھوں نے خود کہا ہے وہی نظریہ ہے۔ جو صاحب شریعت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اور جس کو اسلام کے نامور فرزند علامہ ابن حزم نے پسند کیا اور جس کو حکیم پاکزاد مرشد رومیؒ نے اپنایا اور جو علامہ ثعلبی نے اختیار کیا۔ علامہ ثعلبی کے نزدیک تاویل کے معنی یہ ہیں کہ لفظ جس معنی کے لیے وضع کیا گیا ہے اس لفظ سے وہی معنی مراد لیا جائے مگر علامہ فرماتے ہیں کہ لفظ کے عام مستعمل معنی کو چھوڑ کر دوسرا معنی لیا جائے تو یہ تاویل ہے ان دونوں میں بہت فرق ہے کیونکہ بسا اوقات ایک لفظ کا اصلی معنی جس کے لیے وہ لفظ موضوع ہے متروک ہو جاتا ہے اور لفظ کسی اور معنی میں عام طور پر مستعمل ہونے لگتا ہے۔ ایسے حالات میں اگر لفظ کا عام مستعمل معنی مراد لیا جائے گا تو علامہ ثعلبی کے نزدیک اس کو تفسیر نہ کہیں گے بلکہ

تاویل کہیں گے مگر علامہ اقبال کے نزدیک یہ تفسیر ہو گی نہ کہ تاویل۔ چونکہ علامہ اقبال کا ذہن عام معاشرتی و معاشی مسائل کو سلجھانے کی فکر میں ہے اس لیے وہ اس چیز کو ترجیح دیتے ہیں، جو عام استعمال میں ہو۔ اس لیے علامہ اقبال کا نظریہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

ایک بات مسلمہ ہے کہ حضرت علامہ اقبال دور از کار تاویلات سے نہ صرف اجتناب کرتے تھے۔ بلکہ ایسی تاویلات کو قومی تباہی کا سبب اور اسلامی ثقافت کے لیے زہر ہلاہل تصور کرتے تھے۔ اپنی مشہور نظم "کتاب زندہ" میں کہتے ہیں۔

حرف او را ریب نے تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تاویل نے

بالِ جبریل میں لکھتے ہیں۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر   تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

اس کا انہیں بہت دکھ تھا کہ مسلمان علماء اپنے سلف کی راہ سے ہٹ کر تحقیق اور حق گوئی کی قوت سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس لیے وہ انتہائی قلق کے ساتھ بارگاہِ سید المرسلین میں عرض گذار ہوتے ہیں اور علماء وقت کی حالت یوں بیان کرتے ہیں۔

نماند آں تاب و تب در خون نابش
نروید لالہ از کشتِ خرابش
نیامِ او تہی از کیسۂ او
بطاقِ خانۂ ویراں کتابش

علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی اس حالتِ زار کہ وہ معاشی طور پر تباہ حال ہو کر اپنی قومی حمیت، شجاعت، جذبۂ جہاد سے محروم ہو چکے ہیں۔ کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ قرآن مجید کو اپنی عملی زندگی میں نافذ نہ کرتے تھے۔ یا تو محض دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے اس کو خوبصورت غلافوں میں سجا کر رکھ دیتے تھے یا اس کے حقیقی معانی کو چھوڑ کر ناقابلِ عمل تاویلات میں پھنسے باہمی تفرقہ بازی میں پڑ چکے تھے، مسلمانوں کے نزدیک اگر قرآن مجید کا کوئی بڑے سے بڑا مصرف تھا بھی تو یہی کہ مرتے وقت یا مرنے کے بعد سورہ یٰسین پڑھ لی۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اقبال کو اس حالت پہ رونا آتا تھا۔ ان کا دردمند دل اس بدبختی پر کڑھتا تھا اور خون روتا تھا۔ وہ ہر موقعہ پر قوم

کو اس غلطی کا احساس دلاتے تھے۔ ارمغانِ حجاز میں ہے ؎

بہ بندہ صوفی و ملا اسیری　　حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست　　کہ از یٰسین او آساں بمیری

حضرت علامہ کے نزدیک قرآن مجید کی پیچیدہ تاویلات میں پھنس کر دین سے نفرت کو اپنے ذہن کے گوشوں میں جگہ دینے کی بہ نسبت یہ بہتر تھا کہ چند لمحے کسی مردِ خود آگاہ کی محفل میں بیٹھ لیا جائے وہ کہتے ہیں۔

ز تاویلات ملایاں نکوتر　　نشستن با خود آگاہے دمے چند

یہ سبق انھوں نے اپنے مرشد رومی سے لیا تھا۔ ان کا ارشاد ہے۔

یک زمانہ صحبتے با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

اقبال مردِ حقیقت شناس نے ایک اور نکتہ تک رسائی حاصل کی اور بڑی شد و مد کے ساتھ اس کی وضاحت کی کہ جب تک ذوقِ یقیں پیدا نہ ہو قومی فلاح و ارتقاء کی راہیں طے نہیں کی جا سکتیں۔ اور "خرد" ذوقِ یقیں سے بیگانہ ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

خرد بیگانۂ ذوقِ یقیں است　　قمار علم و حکمت بدنشیں است
دو صد بوحامد و رازی نیرزد　　بنادانے کہ چشمش راہ بیں است

اقبال کہتے ہیں کہ ذوقِ یقیں کے لیے سوزِ دل ضروری ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ رہنمایانِ قوم کی تقریروں میں اثر نہیں ہے یہی کہ وہ بسا اوقات خرد کی فلسفیانہ موشگافیوں سے عاری ہوتے ہیں اور اگر عقلی استدلالات ان کے پاس ہوتے ہیں تو وہ سینہ میں دلِ پر سوز نہیں رکھتے اور اس خرابی کی وجہ سے وہ بیجا تاویلات میں پھنس جاتے ہیں۔ فلسفیانہ موشگافیوں کو اصل حقیقت سمجھ کر راہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ ان کی باتوں میں اثر نہیں ہوتا بجائے اس کے کہ قوم میں ان کی باتوں سے دین کی محبت کے جذبات پھلیں پھولیں۔ الٹا دین سے نفرت کے خیالات جنم لیتے ہیں اس کا علاج یہی ہے کہ ان رہنمایانِ قوم میں سوزِ دل پیدا کیا جائے۔

بیا تا کار ایں امت بسازیم　　قمار زندگی مردانہ بازیم
چناں نالیم اندر مسجد شہر　　کہ دل در سینۂ ملا گدازیم

حضرت علامہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ میں ایک مقام پر قرآن مجید کی تعلیمات کو فلسفہ کی روشنی میں دیکھنے کے بارے میں کہتے ہیں۔

"علمائے اسلام نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فلسفہ یونان کی روشنی میں کیا مگر یہ بات کہ تعلیمات قرآن کی روح یونانیت کے سراسر خلاف ہے ان کو کہیں دو سو سال کے بعد معلوم ہوئی وہ بھی پورے طور پر نہیں۔ الغرض اس انکشاف کا نتیجہ تھا کہ فلسفۂ یونان کے خلاف ردعمل شروع ہوا جس کی اہمیت کا اندازہ آج تک نہ ہو سکا یہ کچھ اس بغاوت اور کچھ غزالی کے ذاتی حالات کا تقاضا تھا کہ امام موصوف نے مذہب کی بنا فلسفیانہ تشکیک پر رکھی، حالانکہ ان کا یہ خیال کلیتہً قرآن پاک کی تعلیمات کے نہ تو مطابق ہے اور نہ اس کو مذہب کی کوئی مضبوط اور پائیدار اساس قرار دینا ممکن ہے"

علامہ اقبال سراج الدین پال کے نام ۱۹ر جولائی ۱۹۱۶ء کو لکھے گئے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"کل میں ایک صوفی مفسر قرآن کی کتاب دیکھ رہا تھا لکھتے ہیں۔ خلق الارض والسمٰوٰت فی ستۃ ایام ؕ میں ایام کے معنی تنزیلات یعنی ستۃ تنزیلات ہیں کم بخت کو معلوم نہیں کہ عربی زبان میں یوم کا یہ مفہوم قطعاً نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کیونکہ تخلیق بالتنزیلات کا مفہوم ہی عربوں کے مذاق اور فطرت کے خلاف ہے۔ اس طرح ان لوگوں نے نہایت بے دردی سے قرآن اور اسلام میں ہندی اور یونانی تخیلات داخل کر دیئے ہیں۔"

حضرت علامہ عقلی استدلات سے انکار نہیں کرتے۔ قرآن مجید کی حکمتوں اور گوناگوں علوم کو عقلی فلسفیانہ مباحث کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کیا جانا چاہیئے مگر قومی اصلاح کے لیے عام معاشرتی مسائل کے بارے میں دور از کار تاویلات نقصان کا باعث بنتی ہیں۔ اہم چیز جو قوموں میں انقلاب پیدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ عقل کے ساتھ دل کو بھی شامل کیا جائے۔ اقبال کہتے ہیں ؎

ز رازی حکمتِ قرآں بیاموز — چراغے از چراغ او برافروز
ولے ایں نکتہ را از من فرا گیر — کہ نتواں زیستن بے مستی و سوز

قرآن مجید کے مطالب بیان کرنے کے لیے مستی و سوز کے جذبات ضروری ہیں۔ عقلی استدلات کو عشق حقیقی کی ہلکی ہلکی آنچ دی جائے تو ان سے کھوٹ نکل جاتا ہے اور ان میں عجیب تاثیر پیدا ہو جاتی ہے اگر قرآن کا مفسر درد دل کے جذبات میں ڈوب کر قرآن مجید کی تفسیر نہیں کرتا تو اس کی زبان

اثر سے خالی رہتی ہے۔ حضرت علامہ قرآن مجید کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے سوز دل کی ضرورت سے کیا مراد لیتے تھے اس کی وضاحت اس واقعہ سے ہوتی ہے جو انھوں نے خود نقل کیا ہے کہ "جب میں ایف اے میں پڑھتا تھا تو صبح کی نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد صاحب مسجد سے نماز پڑھ کر آتے تو کبھی منزل ختم کر چکا ہوتا کبھی جاری ہوتی۔ ایک دن آکر پوچھتے ہیں کہ کیا پڑھتے تھے؟ مجھے حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آگیا کہ چھ مہینے ہو گئے اور ہر روز دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم پڑھتا ہوں پھر یہ سوال کیسا؟ نہایت نرمی سے فرمایا! میں پوچھتا ہوں کہ کچھ سمجھ بھی آتا ہے؟ اب میرا استعجاب اور غصہ جاتا رہا اور کہا کچھ عربی جانتا ہوں کہیں کہیں سمجھ میں آجاتا ہے۔ بات ختم ہو گئی۔ کوئی چھ ماہ بعد ایک دن لے کر بیٹھ گئے اور فرمایا بیٹا! قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر یہ نازل ہوتا ہے۔ میں حیران تھا کہ نبی اکرم کے بعد قرآن کریم کسی کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔ ..... فرمایا ..... یہ تم نے کیسے سمجھ لیا کہ قرآن کریم حضور کے بعد اب کسی پر نازل ہی نہیں ہو سکتا۔ میں پھر حیران ہوا تو فرمایا انسانیت کو جس معراج پر پہنچانا فطرت کا مقصود ہے اس کا نمونہ ہمارے سامنے "محمدؐ" کی صورت میں پیش کر دیا گیا ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک ہر نبی "محمدؐ" ہی کے مختلف مدارج تھے وہ سلسلے گویا (Muhammad in the Making. تکمیل محمدؐ کے منازل تھے۔ بنیادی اصول ہر جگہ ایک تھا البتہ شعور انسانی کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ فروعات کی تکمیل ہوتی جاتی تھی۔ حتےٰ کہ "محمدؐ" مکمل ہو گیا۔ باب نبوت بند ہو گیا۔ انسانیت اپنے معراج کبریٰ تک پہنچ گئی۔ اب ہر انسان کے سامنے معراج انسانیت کا نمونہ "محمدؐ" موجود ہے کوئی انسان جتنا محمدیت کے رنگ میں رنگا جاتا ہے اتنا ہی قرآن اس پر نازل ہوتا جاتا ہے۔ یہ مفہوم تھا میرے کہنے کا۔ کہ قرآن کریم اس کی سمجھ میں آسکتا ہے جس پر نازل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔"

یہ ہے وہ حقیقت جس کی طرف علامہ اقبال نشاندہی کرتے ہیں اور جس کی محرومی پر وہ افسوس کناں رہتے ہیں۔

تفسیر تاریخی پس منظر میں

حضرت علامہ قرآنی آیات کی تفسیر و تشریح کرتے وقت تاریخی حالات و واقعات کو سامنے رکھنا

پسند کرتے تھے کیونکہ تاریخ واقعاتی دنیا کی بہتر تصویر ہوتی ہے۔ جب ایک شخص واقعاتی دنیا کے مسائل حل کرنے بیٹھے تو اس واقعاتی دنیا کی تشکیل یافتہ اعلیٰ تصویر سے اس کا چشم پوشی کرنا بہتر نتائج کی توقع کو سخت ٹھیس پہنچاتا ہے۔ علامہ اپنے ایک خط میں جو سید نذیر نیازی کے نام لکھا گیا قرآنی آیت "اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "اس آیت کو تاریخی نکتہ نگاہ سے دیکھنا چاہیئے۔ اس مضمون کی آیت قریباً تمام کتب سماوی میں موجود ہے اس کا مقصود یہ نہیں کہ خدا مادی معنوں میں نور ہے (Light dealt with in Physical. Science) یعنی جس طرح علوم طبعیہ میں نور سے بحث کی جاتی ہے۔ نور محض ایک استعارہ ہے جیسے قدیم کتب سماوی میں (Panthaistic) اغراض کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ یعنی وجود باری کو ہمہ گیر (Panthaistic) ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے میری ناقص رائے میں اس قدیم استعارہ کو وجود باری کی مطلقیت (Absoluteness) پر اشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عالم مادی بھی زمانہ حال کی تحقیق کی رو سے صرف نور ہی ایک ایسی چیز ہے جو (Relatively Absolute) ہے۔"[9]

حضرت علامہ کی اس عبارت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ تفسیر قرآن میں قدیم کتب سماوی کو مدنظر رکھنے کے حامی تھے ہمارے کئی مفسرین نے یہود و نصاریٰ کی بیشمار روایات کو اپنی تفسیروں میں جگہ دی ہے۔ فن تفسیر میں اس کی اہمیت اتنی بڑھی کہ اس کے لیے "اسرائیلیات" کے نام سے باقاعدہ ایک عنوان اور اصطلاح تجویز کرنا پڑی مگر مفسرین نے جس کثرت کے ساتھ ان روایات کو قلمبند کیا ہے اور پھر خود انہوں نے اور ان سے زیادہ بعد کے آنے والوں نے جس طرح اپنے اپنے ذوق اور خیالات کے مطابق افکار و نظریات کی راہیں نکالی ہیں اور اپنی ذاتی خواہشات کو جس انداز میں دین کا رنگ دیا ہے یہ چیز ملی عقائد اور معاشرتی زندگی کے لیے کچھ اچھی ثابت نہیں ہوئی اس لیے کئی علماء حق خصوصاً شاہ ولی اللہؒ وغیرہ نے اس بات پر زور دیا ہے کہ اسرائیلیات پر انحصار و اعتماد ختم کیا جائے۔ علامہ اقبال قدیم کتب سماوی کو محض تاریخ کی حیثیت سے سامنے رکھنا بہتر خیال کرتے ہیں۔ قرآن کریم کے اصلی عقائد و مسائل کو چھوڑ کر باقی معاملات میں اگر ایک چیز کے بارے میں کئی مختلف احتمالات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان میں سے کسی ایک احتمال کی تائید قدیم کتب سماوی سے ہو جاتی

ہے اور وہ احتمال دین کے کلی اصول سے بھی متعارض نہیں ہوتا تو قدیم کتب سماوی کی وہ تائید بطور دلیل پیش کی جاسکتی ہے۔

علامہ اقبال قرآنِ مجید کی تفسیر کرتے وقت دیگر مذاہب کی کتب کو سامنے رکھنے کے لیے ایک اور وجہ بھی بتلاتے ہیں وہ یہ کہ "قرآن فطرت اللہ ہے یعنی دنیا میں مختلف اوقات میں مختلف حقائق ظاہر ہوئے۔ کوئی یہاں، کوئی وہاں، ہر حقیقت فطرت اللہ ہوتی ہے۔ ان حقائق کے منتشر اوراق ایک جگہ جمع کر دیئے اس مجموعہ کا نام "قرآن کریم" ہے۔ اب بھی جہاں کہیں کوئی حقیقت ظاہر ہوگی وہ لینن کے الفاظ میں ہو یا سینوسی کے۔ قرآن ہی کی کسی آیت کا ترجمہ ہوگا اس لیے کہ حیاتِ انسانی کے لیے جس قدر حقائق کی ضرورت ہے وہ سب کے سب اس کے اندر آچکے ہیں اب قرآن کریم کو اس طرح سمجھنا چاہیے جس طرح یہ دنیا کو ملتا چلا آیا ہے۔ کبھی ایک حقیقت کسی زردشت کو ملی تھی۔ کہیں کسی بدھ کو وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے پہلے ان تمام مذاہب کو دیکھئے وہاں نظر آجائے گا کہ حقائق کون کون سے ہیں اور افسانے کون کون سے۔ حالانکہ ان مذاہب والے ان افسانوں کو بھی حقائق ہی سمجھتے ہوں گے۔ ان کے حقائق قرآن مجید میں موجود ہوں گے اور ان افسانوں کی تردید ہوگی۔ یہ افسانے انسانی دماغ کے وضع کردہ ہوں گے۔ جب تک ان افسانوں سے واقفیت نہ ہو معلوم نہیں کہ قرآن کریم کس چیز کی تردید کر رہا ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم میں ہے کہ ہم نے ارض وسما کو "لاعبین" (in sport) یعنی کھیل کود میں پیدا نہیں کیا۔ ہندوؤں کے ہاں عقیدہ ہے کہ تمام کائنات ایشور نے ایک "لیلا" (کھیل تماشا) رچائی ہے چنانچہ ان کے بے شمار خداؤں میں سے ایک خدا کا نام "نٹ راجن" (کھلاڑیوں کا راجہ) ہے۔ اس کی مورتی بھی ایسی ہے کہ وہ راگ رنگ میں مصروف ہے اور دنیا پیدا ہوتی جاتی ہے۔ یہ ایک افسانہ ہے جس کی تردید اس آیت میں موجود ہے وما خلقنا السمٰوٰت والارض وما بینھما لاعبین ما خلقنا ھما الا بالحق ولکن اکثر الناس لا یعلمون (دخان)، یعنی زمین اور آسمانوں کا عظیم و وسیع کارخانہ کوئی کھیل تماشا نہیں بلکہ بڑی حکمت سے بنایا ہے جس کا مثبت نتیجہ ایک دن نکل کر رہے گا لیکن اکثر لوگ نادانی میں مبتلا ہیں، یا مثلاً قرآن کریم میں ہے "لا تاخذہٗ سنۃ ولا نوم" (خدا کو اونگھ یا نیند نہیں آتی) ہندوؤں کے ہاں ایک

حقیدہ ہے کہ سب کائنات پر ماتا دفنا) کا تخلیہ ہے۔ جب وہ بیدار ہو جائے گا تو یہ خواب پریشان ہو جائے گا۔ خود ہمارے بعض صوفیہ کے ہاں بھی اس قسم کے غیر اسلامی تصورات موجود ہیں اس افسانے کی تردید قرآن کریم نے اوپر والی آیت میں کر دی ہے۔"

منتخب آیات کی تفسیر

علامہ اقبال اگرچہ قرآن مجید کی باقاعدہ تفسیر نہ لکھ سکے مگر بعض آیات پر انھوں نے اپنے تفسیری و تشریحی خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس کا موقع اکثر اہل علم کے ساتھ مجلس کے دوران آجاتا تھا مثلاً ایک مرتبہ حکیم محمد حسین عرشی اور حکیم طالب علی ان کی مجلس میں حاضر تھے کہ حکیم طالب علی نے سورہ النجم کے پہلے رکوع کی تشریح دریافت کی تو علامہ نے اس پر طویل تقریر فرمائی اور خصوصاً (فکان قاب قوسین او ادنیٰ) کی تفسیر کرتے ہوئے ان تاویلات کی تردید کی جو بعض مفسرین نے اس آیت کے ضمن میں پیش کی ہیں یہاں تک کہ ایک غیر مسلم مترجم قرآن نے اس مقام کو خاتم الانبیاء کے لئے کسی شخص کی ذہنی کاوش بتلایا۔ علامہ اقبال نے اس کی جو تفسیر فرمائی اس کا خلاصہ یہ ہے کہ "ناسوت و لاہوت یا عقل و وحی یا عالم بشریت و عرش الوہیت کو دو کمان نما دائروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بشری عقل کا منتہائے کمال یہ ہے کہ وحی سماوی سے کامل مطابقت حاصل کرلے یعنی اس ترقی یافتہ عقل کے رباب سے کبھی کبھی جو نغمہ بلند ہوتا ہے وہ الہام سماوی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے اس طرح یہ دونوں کمان کامل اتصال کے مقام پہ پہنچ جاتے ہیں۔ نوع انسان میں انبیاء بالعموم اور حضرت خاتم الانبیاء بالخصوص اس مقام کے آخری نقطے سے وصل پذیر ہوئے" یہ تقریر کرنے کے بعد ساتھ ہی حضرت علامہ نے تنبیہاً فرمادیا کہ "اس تقریر سے یہ شبہ نہیں کرنا چاہیئے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہے کیونکہ وحی الٰہی میں فہم بشری کا قطعاً دخل نہیں"۔ حضرت علامہ اس دقیق ترین مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ "جرمنی میں ہمارے ایک پروفیسر علم ریاضی کے بہت زیادہ ماہر تھے۔ کبھی کبھی طلبہ بہت ہی مشکل سوالات ان سے پوچھتے تو وہ فوراً جواب دے دیتے اور اگر طلبہ ان جوابوں کی تشریح چاہتے تو کہہ دیتے کہ اس کے لیے دو ہفتہ کی مہلت چاہیئے کیونکہ ان کے نزدیک جواب دینا تو سہل تھا مگر اس کا

عمل سمجھانا مشکل اور دیر طلب تھا۔ اسی طرح عقل و وحی کا تطابق ہر فن کے باکمال لوگوں میں پایا جاتا ہے۔"

آیاتِ متشابہات

عرفی صاحب نے ایک مجلس کے دوران حضرت علامہ سے سوال کیا کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "یسرنا القرآن للذکر" اور "فصلناہ علیٰ علم تفصیلا" اور دوسری طرف بہت سی آیات کو متشابہات کہہ کر ان کے سمجھنے کو "وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم" کی قید سے مقید کر دیا۔ اس تضاد کی کیا وجہ ہے؟ تو علامہ نے فرمایا۔ اس کو یوں سمجھو۔ ایک دفعہ لندن میں ایک صاحب نے کسی مہمان کے اعزاز میں چند دوستوں کو دعوت دی اس میں میں بھی شامل تھا۔ طعام سے فارغ ہونے کے بعد مہمانِ محترم سے تعارف کرایا گیا تو پتہ چلا کہ آپ ماہر حجریات ہیں۔ میں نے ان سے دوبارہ ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تو فیصلہ ہوا کہ اکٹھے سیر کو چلیں گے۔ چنانچہ سیر کرتے ہوئے ہم سمندر کے کنارے جا پہنچے میں نے ان سے کہا کہ اپنے مضمون (حجریات) کے متعلق فرمائیں انہوں نے کنارے پر ایک چھوٹا سا پتھر اٹھایا اور اس کی سوانح عمری بیان کرنا شروع کر دی حتیٰ کہ ہم پندرہ دن روزانہ سیر کو جاتے رہے اور وہ اس پتھر کے ٹکڑے کے اسرار و رموز بتلاتے رہے اس کے مدارجِ نشو و ارتقاء ہر درجے کے زمانے کا تعین اس کے اجزائے اولیہ رنگ ٹھوس پن۔ صورت نوعیہ وغیرہ کے تفصیلی اسباب، تاثیرات و خواص وغیرہ اتنی باتیں بیان کر دیں جو میرے لیے اور اس علم سے ناواقف ہر شخص کے لیے پردۂ اخفا میں تھیں۔ یا متشابہ تھیں اور اس کے لیے جو راسخ فی العلم تھا یہی باتیں مفصل و میسر تھیں۔ اسی طرح قرآن مجید سارے کا سارا مفصل بھی ہے اور متشابہ بھی۔ جس قدر انسان کا ذوق اور وجدان اور روحانیت ترقی کرتے جائیں گے اس پر قرآن کے مطالب آشکار ہوتے جائیں گے۔"

علامہ سے قرآن مجید کی آیت "والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا" کے بارے میں سوال کیا گیا تو فرمایا "تمام علوم و کمالات اور مقاصدِ عالیہ جو نوعِ انسان کے لیے کسی نہ کسی حیثیت سے مفید ہوں ان کے حصول کی سعی جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے اور اس مشق و مزاولت کے ارتقائی نتائج لنھدینھم کا ظہور ہیں۔

بعض قرآنی موضوعات پر تفسیری مباحث

علامہ اقبال کی فکر کا محور و مرکز قرآن مجید ہے اسی لیے انہوں نے بعض قرآنی موضوعات پر تفسیری مباحث کئے ہیں۔ مثلاً

وحدتِ ملی

قرآن مجید ملی وحدت کی طرف دعوت دیتا ہے ارشاد ہوتا ہے۔ "واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا" یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لو اور باہمی تفرقہ بازی سے بچو۔ یہ ملی وحدت اور جمعیت کیا شے ہے؟ اس کا حصول کس طرح ممکن ہے؟ اس کے بنیادی عناصر کیا ہیں؟ اقبال جابجا ان کے جوابات کی وضاحت کرتے ہوئے کبھی عظیم فلسفی کی طرح اور کبھی صوفی اور مردِ قلندر کی طرح اس کی تفسیر بیان کرتے ہیں تو کبھی شفیق استاد کی طرح اس فلسفہ کے تاریک گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں اور کبھی قوم کے دردمند طبیب کی طرح اپنے آنسوؤں سے قوم کے زخموں کو دھوتے ہیں اور اپنے حکیمانہ کلام سے اس طرح مرہم پٹی کرتے ہیں کہ قومی روح کے تمام بھوڑے تسکین محسوس کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں ؎

اپنی اصلیت پہ قائم تھا تو جمعیت بھی تھی
چھوڑ کر گل کو پریشان کارواں بو ہوا
آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

حضرتِ علامہ کے ذہن رسا کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ بڑے اہم اور پیچیدہ مسائل کو ہلکی پھلکی اور عام فہم مثالوں کے ذریعے واضح کر دیتے ہیں "گل" کو چھوڑ کر "کاروانِ بو" کا پریشان ہونا ملت کے مرکز سے بھٹک جانے کے لیے خوبصورت مثال ہے ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس شعر میں ملی جمعیت کی اہمیت کو دریا اور اس کی موجوں کی مثال سے ثابت کیا ہے۔ دریا کی

طغیانی اور اس کے تھپیڑوں کی طاقت کا راز صرف موجوں کی جمعیت میں ہے اگر ہر موج الگ الگ کر دی جائے تو دریا اپنا وجود ہی باقی نہیں رکھ سکتا۔ بالکل یہی حال ملت کا ہے۔ اگر افراد باہم متحد ہیں تو جمعیت باقی ہے اور جمعیت کی بقا ہی ملی بقا کی ضامن ہے اس جمعیت کی بنیاد کس چیز پر ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو اس جمعیت کے لیے موثر اور حقیقی سبب بن سکتی ہے؟ اقبال کہتے ہیں۔

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قرآن مجید نے جمعیت کے لیے "حبل اللہ" کو مضبوطی سے تھام لینے کا حکم دیا ہے اور "حبل اللہ" کیا ہے۔ علامہ اس کو دین کے نام سے پکارتے ہیں۔ وہ ایک دوسری جگہ یوں فرماتے ہیں ؎

قوم مذہب سے ہے مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذب باہم جو نہیں محفل انجم بھی نہیں

عمل پیہم

عمل پیہم قرآن مجید کا بہت ہی اہم موضوع ہے۔ قرآن مجید ہر لمحہ کوشش اور انتھک کوشش کا داعی ہے۔ عمل کا لفظ تقریباً دو سو مرتبہ مختلف صیغوں میں قرآن مجید میں ملتا ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

قرآن مجید اکثر مقامات پر ایمان کے ساتھ عمل صالح کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے انداز بیان سے واضح ہوتا ہے کہ عمل صالح کے بغیر ایمان کوئی وقعت (Value) نہیں رکھتا اقبال کہتے ہیں۔

یہی آئین قدرت ہے یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

یہ ساری کائنات اور اس کے سارے ہنگامے جذبۂ عمل کے فطری تقاضوں کے مرہون منت

ہیں۔ اقبال کہتے ہیں عمل کا فطری تقاضا ہی تھا جس نے آدم کو جنت میں بیٹھنے نہ دیا اور اس کائنات کی تمام تر رعنائیاں اس جذبۂ عمل کی منت کش ہیں۔

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں — پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے
ملا مزاجِ تغیر پسند کچھ ایسا — کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا — چھپایا نورِ ازل زیرِ آستیں میں نے
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں — دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے
سنایا ہند میں آ کر سرودِ ربانی — پسند کی کبھی یوناں کی سرزمیں میں نے
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی — بسایا خطۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے
سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی — اسی خیال میں راتیں گزار دیں میں نے
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں — سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے
کیا اسیر شعاعوں کو برقِ مضطر کو — بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

یہ ساری کہانی یہ ساری داستاں عمل پیہم کا نتیجہ ہے جو قومیں عمل پیہم کا جذبہ کھو بیٹھتی ہیں قانونِ فطرت ان کے لیے کیا فیصلہ کرتا ہے، یہ علامہ کی زبانی سنیں۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی — یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
چلنے والے نکل گئے ہیں — جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

آخر اقبال کہتے ہیں کہ یہی عمل پیہم ہی زندگی کا راز ہے جو قومیں یہ راز پالیتی ہیں وہ زندہ رہتی ہیں ورنہ موت ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

رازِ حیات پوچھ لے خضرِ خجستہ گام سے
زندہ ہر اک چیز ہے کوششِ ناتمام سے

تسخیرِ کائنات

تسخیرِ کائنات بھی قرآن مجید کا اہم موضوع ہے۔ علامہ کہتے ہیں "قرآن سے پہلے کسی ارضی یا سماوی کتاب نے انسان کو اس بلند مقام پر نہیں پہنچایا جس کی قرآن مجید نے اطلاع دی ہے یہ لفظ

تم قرآن کے سوا کہیں نہ دیکھو گے " وسخر لکم ما فی السمٰوٰت وما فی الارض "
آج تک تم جن ارضی وسماوی، مہیب یا مفید ہستیوں کو اپنا معبود سمجھتے رہے ہو وہ سب اور دیگر تمام کائنات تمہاری خدمت کے لیے خلق کی گئی ہے توحید کا یہ مرتبہ اعلیٰ ماسوا سے بے پرواہ کر دینے والا یہ انسانی خودی کا حقیقی عرفان، قرآن سے پہلے نظر نہیں آتا "

قرآن مجید علامہ کے نزدیک پیغام انقلاب ہے، زندگی ہر سطح پر اور ہر دوسرے لمحہ انقلاب پذیر ہے جو انقلاب قرآن کی ہدایات (Directions) کے مطابق ہے وہ کامیاب ہے ورنہ تو وہی انقلاب فساد کا باعث بنتا ہے، قرآن مجید انسان کو ہر لمحہ یہ پیغام دیتا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔

انقلابات اور تغیرات کائنات کے ہر گوشے میں بپا ہوتے رہیں گے جو بشر ان سے روگردانی کرے گا ان سے بے اعتنائی برتے گا یا ان کا غلط استعمال کرے گا وہ منزل مقصود نہ پا سکے گا یہ ساری کائنات انسان کے لیے مسخر کر دی گئی ہے اس سے فائدہ حاصل کرنا انسان ہی کا کام ہے۔

اقبال کہتے ہیں ۔

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے　　جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لیے

قرآن کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ اقبال انسان کو قوت اور اس کے مقام سے آشنا کراتے ہیں :۔

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ　　تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

قرآن مجید واضح الفاظ میں اعلان کرتا ہے " انتم الاعلون ان کنتم مومنین "
اس نکتہ کو اقبال یوں بیان کرتے ہیں ۔ ؎

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

علوم قرآنیہ

حضرت علامہ علوم قرآنیہ پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں علم کے چار ذریعے ہیں اور قرآن مجید

نے ان جہتوں کی طرف واضح رہنمائی فرمائی ہے۔ مسلمانوں نے ان کی تدوین کی اور دنیائے جدید اس باب میں ہمیشہ مسلمانوں کی منت کش رہے گی۔ پہلا ذریعہ وحی ہے اور وہ ختم ہو چکا دوسرا ذریعہ آثار و تاریخ ہے جس پر آیات قرآنی متوجہ کر رہی ہیں۔ ارشاد ہے "سیروا فی الارض" اس آیت نے علم آثار کی بنیاد رکھ دی جس پر مسلم مصنفین نے عالی شان قصر تعمیر کئے۔ "وذکرھم بایام اللہ" یہ آیت تاریخ کا ابتدائی نقطہ ہے جس نے ابن خلدون جیسے باکمال محقق پیدا کئے۔ علم کا تیسرا ذریعہ علم النفس ہے جس کا آغاز "وفی انفسکم افلا تبصرون" سے ہوتا ہے۔ اس کو حضرت جنید بغدادی اور ان کے رفقاء و اتباع نے کمال تک پہنچایا۔ آخری ذریعہ صحیفۂ فطرت ہے جس پر قرآن مجید کی بے شمار آیات دلالت کرتی ہیں۔ مثلاً "والی الارض کیف سطحت" اس علم پر علمائے اندلس نے بہت توجہ مبذول کی۔" میں اپنے مختصر مقالے کو حضرت علامہ کے اس ارشاد پر ختم کرتا ہوں۔ حضرت علامہ کے تفسیری نوٹس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ کام کرنے کی ضرورت ہے اور یہ کام بہترین علمی سرمایہ ہوگا۔

ماہنامہ فکر و نظر اسلام آباد

حسب روایت اس سال بھی ماہ اکتوبر میں حج بیت اللہ کے مبارک اور مقدس موقع پر ایک خاص نمبر شائع کر رہا ہے۔ جس میں حج کے موضوع پر مقتدر اہل قلم حضرات کی تحقیقی نگارشات شامل اشاعت ہوں گی۔ مضمون نگاروں سے التماس ہے کہ وہ اپنے مضامین ۲۰ اگست تک ارسال کر دیں۔ ضخامت تین سو صفحات سے زاید ہوگی۔

مشتہرین اور ایجنٹ حضرات بھی نوٹ فرمالیں۔

(ادارہ)